© rasailojaraid.com

احکام ذبح شریعت کی نگاہ میں

مولانا محمد صباح الدین قاسمی فلاحی

اسلام کا فلسفۂ تذکیہ

انسان کی غذا اور خوراک کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار چیزیں پیدا کی ہیں، ان سب کو دو بڑے عنوانات 'حیوانی اور غیر حیوانی غذا' میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حیوانی غذا کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ کسی جاندار مخلوق کی جان لے کر فراہم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی ذی حیات شے کی جان لینے کا ہمیں کیا حق پہنچتا ہے اور اس لیے اس کے جینے کا حق چھین لینا کہاں کی معقولیت ہے؟ کیا قتل و خونریزی کا یہ فعل اس شرف و کرم، فطرت صالحہ اور عقل سلیم کے خلاف نہیں ہے جو انسانیت کے ناطے ہمیں ملا ہے، پھر کیا یہ درندگی اور سبعیت نہیں ہے کہ انسان اپنی ہی طرح کی کسی ذی روح مخلوق کو چیر پھاڑ کر کھا جائے؟ — اس سوال کے پیش نظر یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ اسلام نے غذائے حیوانی کی حلت و جواز کے حق میں اس کی کیا معقول، منطقی اور اخلاقی توجیہ کی ہے؟

مخلوقات کی قسموں جمادات، نباتات اور حیوانات میں سب سے اعلیٰ مخلوق حیوانات کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مادہ اور روح دونوں سے مرکب ہے پھر حیوانات میں بھی انسان سب سے اشرف و اکرم ہے۔ چونکہ اسلام کے مطابق انسان ہی تخلیق ارض و سما کی غایت ہے اور دیگر مخلوقات اس کے لیے مسخر کی گئی ہیں، نیز مالکِ کائنات نے اسے کائناتِ ارضی میں اپنا خلیفہ اور بندہ بنا کر بھیجا ہے، اس لیے اسے تصرف کا اختیار بھی بخشا گیا ہے اور اپنے حقیقی مالک کو ماننے اور نہ ماننے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ اس آزادی کے نتیجہ میں انسانوں کی دو جماعتیں بن جاتی ہیں: ایک اپنے مالک حقیقی کو ماننے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوراس کے احکام پرعمل کرنے والوں کی، دوسری اس کے منکرین ومتمردین کی۔ یہ تو انسانی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ اس کے وجود و بقا کے لیے کھانے پینے کی ضرورت بھی لگا دی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دیا ہے خواہ وہ خبائث مادی وجسمانی ہوں یا اخلاقی وروحانی اور طیبات وخبائث دونوں کی خوب تشریح فرما دی ہے جہاں تک حیوانی غذا کا تعلق ہے تو اس میں نباتات کے برعکس حیات وروح اور خون کا عنصر بڑھنے سے کچھ خصوصی حدود وقیود کی ضرورت تھی۔

سوال یہ تھا کہ ایک جاندار کی جان لینے کا انسان کو کیونکر حق پہنچتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ بطور خود بلاشبہ اسے اس کا حق نہیں پہنچتا مگر کیا خالقِ حیوان اور مالکِ حیات و روح کو بھی یہ حق انسان کو تفویض کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ایک منکرِ خدا کے لیے بھی اصولی طور پر یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا مکمل اختیار رہا کرتا ہے۔ تو اصل بات یہی ہے کہ مالکِ حیوان نے خود اس کے ذبح کرنے کا خصوصی اجازت نامہ دیا ہے۔ مگر اس اجازت کے مستحق صرف خدا کے مؤمن بندے ہی قرار دئے گئے ہیں کیونکہ اس کے باغی بندے اس خصوصی عنایت واجازت کے اہل نہیں ہوسکتے۔ اسی لیے مسلم وکتابی کی شرط عائد کی گئی اور اسی لیے اس عنایت خاص کے تذکرا اور یاددہانی کے طور پر تسمیہ کی قید بڑھائی گئی۔ جانور کا مالک مشرک بھی ہوتا ہے اور مومن بھی مگر وہ صرف اس کے مادی وجود اور اس کے منافع کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کی روح کا مالک بدستور خالقِ روح ہی ہوتا ہے۔ محض مادی ملکیت اس کی جان لینے کا پروانہ نہیں بن سکتی۔ مادی ملکیت تو ایک غلام انسان کی بھی دوسرے انسان کے لیے جائز ہوتی ہے اور اس میں بھی مومن وکافر یکساں ہوتے ہیں مگر دونوں ہی کو صرف جسمانی ملکیت ہی حاصل ہوتی ہے۔ روحِ حیات پر کسی کو ملکیت نہیں دی گئی۔

معاملہ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ حیوانی غذا کے حصول کی ظاہری صورت چیر پھاڑ اور خوں ریزی ودرندگی (افتراس وسبعیت) کی ہم شکل ہے۔ اس کے جواز سے مزاجِ انسانی میں درندگی کے اثرات آسکتے تھے اس کے تدارک کے لیے شارع نے بوقتِ ذبح تسمیہ کی پابندی لگا کر ایک نفسیاتی علاج فرما دیا۔ اس سے اس بظاہر عملِ وحشت ودرندگی میں عبادت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تقدس کا عنصر شامل ہوگیا جس نے طبع انسانی کو غلط سمت کی طرف مائل ہونے سے بچا لیا۔

ان مذکورہ بنیادی امور کے پہلو بہ پہلو دو مزید باتیں ضمناً شارع کے پیشِ نظر رہی ہیں ایک یہ کہ جانور کی قربانی اور ذبح کے معاملہ میں جو مشرکانہ عقائد و اعمال در آئے ہیں ان سے ذبیحۂ مسلم کو بالکل پاک کر دیا جائے۔ نہ صرف غیر اللہ کا نام لینا حرام ہو بلکہ ان کی قربان گاہوں پر ذبح کرنا بھی حرام ہو اور اس کے مقابلے میں مومن کے ذبیحہ کی شان یہ ہو کہ وہ بوقت ذبح نہ صرف اپنے ذبیحہ پر محض اللہ کا نام لے بلکہ یہ بھی گوارا نہ کرتا ہو کہ کوئی ذبیحہ اللہ کا نام لیے بغیر انجام پا جائے۔ دوسری بات یہ کہ ملتِ مسلمہ کو ملت کافرہ و مشرکہ سے اس معاملہ میں کلی اجتناب کا حکم دے دیا گیا تاکہ مسلمان کے خورد و نوش کا سامان خبائث کے شائبہ سے بھی پاک رہے۔

ان ہی امور کی خاطر شارع نے گوشت کی حلت کے لیے تذکیۂ حیوان کی شرط لگائی اور اس کے تین بنیادی ارکان رکھے:

(۱) احسانِ ذبح (۲) ذکر اسم اللہ (۳) ذابح کا مسلم یا اہلِ کتاب ہونا۔

حکمتِ ذبح

گوشت حاصل کرنے کی تین صورتیں ہو سکتی تھیں:

(الف) زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ کر استعمال کر لیا جاتا۔

(ب) زندہ جانور کے جسم میں کہیں بھی مہلک اور کاری ضرب لگا کر اور اسے چیر پھاڑ کر اس کی بوٹیاں بنائی جائیں۔

(ج) جانور کو ذبح کر کے اس کی روح اور خون پوری طرح نکال کر گوشت بنایا جائے یعنی طریقۂ ذبح و نحر و عقر۔

ان تینوں صورتوں میں سے شریعت نے صرف تیسری صورت کو ذبیحۂ طیب کے لیے تجویز کیا۔ اس کی دو حکمتیں بالکل واضح ہیں:

(۱) ازالۂ حیات اور اخراج دم۔ ازالۂ حیات کی حکمت یہ ہے کہ زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ کر نہ کھایا جائے اور اخراجِ دم کی حکمت یہ ہے کہ مردار نہ کھایا جائے۔

(۲) آدمی اور درندے کے کھانے میں فرق و تمیز: انسان کی فطرتِ سلیمہ ذبح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے علاوہ حصولِ گوشت کی دوسری دونوں صورتوں سے اِبا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ظلم اور ایذا رسانی کی شکلیں ہیں جو سباع و وحوش کا خاصہ ہے۔

حکمتِ تسمیہ

اس سلسلہ میں ۴ صورتیں ممکن تھیں:

(الف) ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے، یا 'نُصُب' پر ذبح کیا جائے۔

(ب) اللہ کے ساتھ غیر اللہ کا نام بھی لیا جائے۔

(ج) کسی کا نام نہ لیا جائے۔ (د) اللہ کا نام لیا جائے۔

ان چاروں صورتوں میں صرف چوتھی صورت ذبیحہ حلال کے لیے شرعاً موزوں قرار پائی، صورتوں کے اس رد و قبول میں تین حکمتیں ملحوظ ہیں:

(۱) قتلِ حیوان کے ذریعہ حصولِ گوشت کے خصوصی اجازت و انعام پر اللہ کا ذکر۔

(۲) سبعیت و درندگی کے نفسیاتی اثرات کا ازالہ۔

(۳) شرک اور مشرکانہ اعمال سے کراہیت و تنفر پیدا کرنا۔

تسمیہ کے بغیر ان تینوں حکمتوں میں سے کوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو یہ ذبح درندگی اور ظلم و بربریت کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے، یہ تسمیہ بغرض نیت نہیں ہے کیونکہ عمل ذبح ایک معقول المعنی (ظاہری اثرات رکھنے والا) عمل ہے اس کے ظہور و صدور کے لیے محض ارادۂ عمل کافی ہے۔ عملِ ذبح کا کوئی باطنی مقصود نہیں ہے کہ اس کی قبولیت کے لیے نیت کی ضرورت ہو۔ بطور تبرک افتتاح عمل کے لیے بھی یہ تسمیہ نہیں ہے جیسا کہ اور اعمال میں یہ مشروع ہے۔ یہ تسمیہ سرّی بھی کافی نہیں ہے بلکہ جہری ضروری ہے کیونکہ اسی صورت میں مقصدِ تسمیہ پورا ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ مجید میں بوقت ذبح 'ذکر اللہ' کا حکم نہیں بلکہ ذکر اسم اللہ' کا حکم ہے۔ بعد میں تسمیہ کی حکمتوں میں شرک سے تنفر کا بھی اضافہ ہو گیا جب گمراہ انسانوں نے جانوروں کی قربانی اور ذبیحہ کو مشرکانہ عبادات اور تقربات میں شامل کر لیا۔

حکمتِ اہلیت ذابح

اس سلسلہ میں تین صورتیں ہو سکتی تھیں:

(الف) صرف مسلمان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا جانا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ب) مسلمانوں کے ساتھ سابق ملت مسلمہ (اہل کتاب) کو بھی اہل ذبح قرار دیا جاتا۔
(ج) مسلمان اور اہلِ کتاب کے ساتھ اہلِ شرک کو بھی اہل تذکیہ مانا جاتا۔

ان میں دوسری صورت یعنی مسلم وکتابی کی اہلیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ یہ حقیقتِ تسمیہ کا لازمہ ہے۔ اللہ کا نام اللہ کا ماننے والا ہی لینے کا مجاز ہے۔ قتلِ حیوان کی اباحت اور انعام اطاعت کے ساتھ زیب دیتا ہے نہ کہ انکار اور بغاوت کے ساتھ، تیسری حکمت یہ ہے کہ اہلِ شرک اور اہلِ ایمان کے کھانے میں مکمل فرق وامتیاز برقرار ہے۔ مومن کے غذائی طیبات میں خبائث کا لوث شامل نہ ہو۔

حیوانی غذا کے باب میں یہی وہ حکم ومصالح ہیں جن کی بنا پر نباتاتی غذا کے مقابلہ میں اسلام نے کچھ خصوصی قیود وحدود تجویز کیے ہیں اور جن کی رعایت حلال وطیب خوراک کے لیے لازم ہے۔

گوشت کی حلت کے اصولی احکام

جانوروں کے گوشت کی حلت اور تذکیہ کے بارے میں جو شرائط قرآن اور پھر احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

(۱) وہ جانور فی نفسہٖ حلال ہو، ان اشیاء میں سے نہ ہو جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔

(۲) جانور کا تذکیہ کیا گیا ہو، یعنی:

(الف) انھیں صحیح طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو (ب) ان کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو (ج) ذبح کرنے والا مسلم یا کتابی ہو۔

مذکورہ بالا امور کی تفصیل حسب ذیل ہے:

وہ اشیاء جن کا کھانا حرام ہے

مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جانے والا جانور حرام ہے۔ یہ حکم دو مکی سورتوں الانعام ۱۴۵، النحل ۱۱۵ اور دو مدنی سورتوں البقرہ ۱۷۳ اور المائدہ ۳ میں وارد ہوا ہے، مائدہ کے الفاظ یہ ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ... فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (المائدہ ۳)

سورہ مائدہ جو آخری احکامی سورہ ہے اس کی یہ آیت پہلے سے مذکور حرام اشیاء میں دو باتوں کا اضافہ کرتی ہے۔ اول یہ کہ صرف وہی مردار حرام نہیں ہے جو طبعی موت سے مرا ہو، بلکہ وہ جانور بھی حرام ہے جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ لگ کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ دوم یہ کہ جو جانور مشرکین کی قربان گاہوں پر ذبح کیا جائے وہ بھی حرمت کے حکم میں مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ کے ساتھ شریک ہے خواہ اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے۔

نبیؐ نے ان حرام اشیاء میں گدھے اور کچلیوں والے درندوں اور پنجوں والے شکاری پرندوں کو بھی شامل فرمایا ہے جیسا کہ بکثرت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے (ملاحظہ ہو نیل الاوطار: کتاب الأطعمۃ والصید والذبائح)

سوالنامہ کا جواب

ان اصولی مباحث کے بعد اب ایک ترتیب سے اس سوالنامہ کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی جو اس موضوع سے متعلق اسلامک فقہ اکیڈمی نے جاری کیا ہے۔

مبحث اول:-

(۱) ذبح کا معنی لغت میں

ذَبَحَ ۔ ذَبْحًا و ذَبَاحًا و ذُبْحانا: اس کی اصل اور مادہ ذ ب ح ہے، جس کے تمام استعمالات میں "شق" یعنی چیرنے، پھاڑنے کا معنی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ذبحت الشاۃ ای قطعت حلقومھا، وذبحت البعیر ای نحرتہ، وذبحت الشئی ای شققتہ، وثقبتہ

چنانچہ مختلف ماہرینِ لغت نے اس جانب اشارہ کیا ہے:

(الف) ذبحہ ۔ ذبحا وذباحا: قطع حلقومہ، والشئی: شقہ۔ والبعیر: نحرہ (الوافیۃ ۲۱۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ب) ذبحہ ۔ ذبحا : قطع حلقومہ، والشئ : شقّہ وثقبہ (المعجم الوسیط ۳۰۹)

(ج) ذبح ۔ ذبحا وذباحا : شقّہ، ونحرہ، وخنقہ ۔ (المنجد ۲۳۳)

(د) ذبح : شقّ وفتق ونحر وخنق ۔ (القاموس المحیط)

بعض لغویین کا خیال ہے کہ ذبح کا حقیقی معنی 'شق حلق الحیوان' ہی ہے، باقی معانی مجازی ہیں : 'اصل الذبح شق حلق الحیوان... وذبحت الفارۃ شققتہا تشبیہا بذبح الحیوان (المفردات ۱۷۹) گویا عربی لغت میں ذبح کے حقیقی اور اصلی معنی 'قطع حلقوم' کے ہیں۔

ذبح کی شرعی تعریف

المعنی الاول : اصطلاح فقہ میں بھی لفظ ذبح کا اصل معنی یہی ہے اور اس معنی میں یہ نحر کا مقابل ہے :

(الف) الذبح ... شرعیۃً قطع الحلقوم من باطن عند التصیل وھو مفصل مابین العنق والرأس (الکلیات ۴۵۸)

(ب) الذبح ... القطع فی الحلق وھو ما بین اللبۃ واللحیین من العنق (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۱/۱۷۱)

(ج) الذبح قطع الحلقوم من باطن عند التصیل وھو موضع الذبح من الحلق (لسان العرب ۳/ ۱۴۴۵)

ذبح کی حقیقت

(الف) انیس الفقہاء میں ذبح کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ :

الذبح قطع الاوداج وھی جمع الودج، وھو عرق فی العنق وھما ودجان وقیل قطع الحلقوم وھو الحلق، وھو منفذ النفس من باطن (۲۷۷)

(ب) معجم لغۃ الفقہاء میں یوں تحریر ہے :

الذبح قطع الحلقوم والودجین وھما العرقان اللذان یحملان الدم إلی الرأس (۲۱۳)

(ج) موسوعۃ فقہیۃ میں درج ہے :

الذبح قطع الأوداج، والمراد الحلقوم والمرئ والودجان، وإنما عبّر عنہ تغلیبا (۲۱/۱۷۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(د) المذاہب الاربعۃ میں اس کی تعریف یہ نقل کی گئی ہے:

ویعرّف الذبح بأنه قطع الحلقوم والودجین من المقدم بمحدد بنیۃ (۷۲۲/۱)

فقہاء کے مسالک

تمام فقہاء کے نزدیک کمال ذبح یہی ہے کہ چاروں اوداج کاٹے جائیں۔ البتہ ان کے درمیان قدر کفایت میں اختلاف ہو گیا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک چاروں رگوں میں سے اکثر یعنی تین کا کٹنا حلال ہونے کے لیے ضروری ہے۔ (بدائع ۶/۲۸۶۸) مالکیہ کے نزدیک حلقوم اور ودجین کو کٹنا چاہیے اور حنابلہ کے نزدیک حلقوم اور مریٔ کو (المذاہب الاربعۃ ۱/ ۷۲۵) شوافع کے نزدیک کم سے کم حلق اور مریٔ کا کٹنا ضروری ہے۔ کتاب الام ۲/۲۲۸، ۲۳۶۔

المعنی الثانی: ذبح کا لفظ نحر کے معنی میں بھی لغت وفقہ میں مستعمل ہے یعنی قطع حلق کے ساتھ قطع لبہ کے معنی میں۔ اس طرح ذبح کا یہ معنی پہلے معنی سے زیادہ عام ہے۔ قرآن میں 'وما ذبح علی النصب' اسی عام معنی میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ یہ ذبح کیے جانے والے اور نحر کیے جانے والے دونوں جانوروں کو شامل ہے۔ نحر اصل میں لبہّ (لبلبہ) میں نیزہ وغیرہ مارنے کو کہتے ہیں، ذبح اور نحر میں فرق یہی ہے کہ نحر لبہ میں ہوتا ہے اور ذبح حلق میں۔

المعنی الثالث: ذبح کے مذکورہ خاص وعام دونوں معنوں کے علاوہ 'عقر' پر بھی ذبح کا اطلاق کیا جاتا ہے جو درحقیقت ایک اعتباری معنی ہے نہ کہ حقیقی یا مجازی۔ یہ معنی سابق دونوں معنوں سے زیادہ عام ہے۔ فقہاء کے فقرہ ' لاتحل ذبیحۃ المشرك' میں ذبیحہ کا مصداق ذبیحۂ عقر بھی ہے یعنی ذبح بذریعہ آلہ وجوارح۔

ذبح کی جامع تعریف

ذبح کے مذکورہ بالا تینوں معنوں کے اعتبار سے فقہاء نے ذبح کی جامع تعریف، اس کی حقیقت وحکمت اور مقصد کو سامنے رکھ کر اس طرح کی ہے:

(الف) الذبح إتلاف الحیوان بازھاق روحه للانتفاع به (البحر الرائق ۸/۱۹۰)

(ب) الذبح إتلاف الحیوان بازھاق روحه فی الحال للانتفاع بلحمه بعد ذٰلك (فتح القدیر ۹/۴۸۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ج) الذبح ازالۃ الحیاۃ، والمقصود بالذبح إذالۃ الدم المحرم وتطییب اللحم (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۱/۱۷۱)

(۲) ذبح کی صحت کے لیے ضروری شرائط

ذبح کے لغوی معنی اور اصطلاحی تعریف پر غور کرنے سے ذبح کی صحت کے لیے مندرجہ ذیل تین شرائط کا علم ہوتا ہے:

اولاً: جانور بوقت ذبح زندہ ہو، اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ ذبح کے وقت مذبوح میں اصلِ حیات موجود ہو، خواہ کم ہو یا زیادہ۔ ذبح اختیاری میں اس کی علامت یہ ہے کہ جانور میں ذبح سے قبل حرکتِ حیات موجود ہو یا پھر ذبح کے بعد حرکت ہو یا سیلانِ خون ہو۔ چنانچہ اگر ذبح سے پہلے حیات کا علم ہو جائے تو ضروری نہیں کہ ذبح کے بعد اس میں حرکت یا سیلانِ خون پایا جائے۔ لیکن اگر زندگی کا پتہ نہ چلے مثلاً بیمار کمزور جانور یا منخنقہ، نطیحہ وغیرہ کہ اس کی زندگی میں آدمی کو شبہ ہو تو اس میں ذبح کے بعد حرکت یا خروجِ دم ضروری ہے۔

ثانیاً: جانور کی موت کا باعث صرف ذبح (قطع اوداج) یا نحر (طعن فی اللبۃ) یا عقر (جرح عضو) ہو۔ مثلاً کوئی ایک بکری کو دو نیم کر دے اور فوراً ہی دوسرا آدمی اس کے اوداج کاٹے درآنحالیکہ اس کے سر میں حرکت موجود ہو یا آدمی ایک ساتھ ہی کسی بکری کو ذبح بھی کرے اور اس کی کھال بھی کھینچی جائے تو یہ ذبیحہ حلال نہ ہوگا کیونکہ اس کی ہلاکت کا سبب محض ذبح نہیں ہے۔ یا مثلاً کسی نے ایک پرندے کا نشانہ لے کر تیر چلایا اور پرندہ زمین پر یا پانی میں گرا اور مردہ پایا گیا تو یہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ معلوم نہیں کہ موت کا سبب صرف تیر کا لگنا ہی ہے یا گر کر چوٹ کھانا اور پانی میں ڈوب جانا۔

ثالثاً: آلۂ ذبح ونحر یا عقر میں کاٹنے، زخمی کرنے اور خون بہانے کی صلاحیت ہو اور وہ ذابح کا اپنا عضوِ بدن (دانت یا ناخن) نہ ہو۔ احادیث کے مندرجہ ذیل فقرے اس شرط کا ماخذ ہیں: کل ما أفری الاوداج (طبرانی) وما انہر الدم (بخاری) لیس السن والظفر (بخاری) یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی پرندہ یا جانور تیر کی نوک یا دھار کے بجائے اس کے معراض کے لگنے سے مرجائے تو وہ حلال نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لغتاً اور اصطلاحاً ذبح کی صحت کے لیے تو یہی تین شرائط ہیں مگر شریعت نے اس ذبیحہ کو اس وقت تک حلال معتبر نہیں کیا ہے جب تک کہ اس میں تذکیہ کے دو ادر ارکان (ذبیحہ پر تسمیہ اور ذابح میں اہلیتِ ذبح) نہ پائی جائیں۔

(۳) ذبح کی تقسیم: اختیاری اور غیر اختیاری، ضروری شرطیں اور مثالیں

شریعت میں ذبح کی دو شکلیں ہیں: اختیاری اور اضطراری

پہلی شکل یہ ہے کہ جانور ہمارے قابو میں ہے اور ہم اس کو اپنی مرضی کے مطابق ذبح کر سکتے ہیں، اس صورت میں باقاعدہ ذبح کرنا ضروری ہے اور اس کا طریقہ شریعت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اونٹ اور اس کے مانند جانور کو نحر کیا جائے اور گائے بکری یا اس کے مانند جانور اور پرندوں کو ذبح کیا جائے۔ اس شکل کو ذبحِ مقدور علیہ کہتے ہیں کیونکہ یہ طریقۂ ذبح ایسے جانور میں اپنایا جاتا ہے جس پر انسان کا قابو ہوتا ہے۔ اس کو ذبحِ اختیاری کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جانور کا باقاعدہ ذبح کرنا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔

دوسری شکل جو عقر کی ہے یہ ہے کہ جانور ہمارے قابو میں نہ ہو مثلاً جنگلی جانور ہے جو بھاگ رہا ہے یا اڑ رہا ہے، یا وہ ہمارے قابو میں تو ہے مگر کسی وجہ سے ہم اس کو باقاعدہ ذبح کرنے کا موقع نہیں پاتے، اس صورت میں جانور کو ذبح کرنے کی شکل یہ ہے کہ ہم کسی تیز چیز سے اس کے جسم کو اس طرح زخمی کردیں کہ خون بہ جائے اور جانور کی موت ہمارے پیدا کردہ زخم کی وجہ سے خون بہنے کی بدولت واقع ہو، یا مثلاً سدھائے ہوئے شکاری درندے کے ذریعہ جنگلی جانور کا شکار کریں اور وہ جانور شکاری درندے کے پھاڑنے اور خون بہنے سے مرجائے۔ چونکہ اس شکل میں جانور قابو میں نہیں ہوتا اس لیے اسے ذبحِ غیر مقدور علیہ کہتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ کبھی جانور پر قابو ہونے کے باوجود بھی سرے سے ذبح کرنا ممکن نہیں ہوتا اسے ذبحِ اضطراری کہا جاتا ہے۔

تذکیہ کے باب میں حقیقی ذبح ذبحِ اختیاری کی شکل ہے۔ ذبح اضطراری دراصل ذبح اعتباری ہے جو ذبح حقیقی کا بدل ہے اور بدل پر عمل صرف اسی وقت جائز ہوتا ہے جب اصل پر عمل ممکن نہ ہو۔ اسی لیے جو جانور قابو میں نہیں ان میں بھی مطلوب اور لازم یہی ہے کہ جب وہ زندہ صورت میں ہاتھ لگ جائیں اور باقاعدہ ذبح کا موقع بھی میسر آجائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اس وقت ذبح حقیقی کا طریقہ اپنایا جائے یعنی ٹھیک محل ذبح میں نحر و ذبح کیا جائے اس کے بغیر وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی وحشی جانور قابو میں آجائے تو اس پر ذبح اختیاری لازم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر مقدور علیہ جانور سرکش اور بے قابو ہو جائے تو اس میں ذبح اعتباری جائز ہو گا۔ یعنی اس کے جسم کے کسی بھی حصہ پر عقر کا عمل کیا جا سکتا ہے، یا مثلاً اگر کوئی اونٹ کسی کنویں میں اس طرح گر جائے کہ اسے ذبح یا نحر کرنا ممکن نہ ہو تو اس کے جس عضو کو بھی چھری وغیرہ سے زخمی کرنا ممکن ہو گا، کیا جائے گا اور اسی کو ذبح سمجھا جائے گا

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تذکیہ کے لیے ذبح کی جو شکل مقصود و مطلوب ہے وہ ذبحِ اختیاری ہے۔ جس میں بنیادی شرط محل ذبح یعنی گردن کی رگوں کا کاٹنا ہے۔ وہ عذر جس سے اضطرار کی صورت پیدا ہوتی اور محل ذبح کی قید اٹھتی ہے صرف یہ ہے کہ محل ذبح میں سرے سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو خواہ جانور پر قابو نہ رکھنے کی وجہ سے یا قابو میں ہونے کے باوجود کسی اور وجہ سے۔ ذبح کے دونوں طریقوں میں اصل فرق یہی ہے کہ ایک میں محل ذبح کا لحاظ برقرار رہتا ہے اور دوسرے میں نہیں رہتا۔ اگر ذبح میں اس کا لحاظ آدمی کے اختیار میں ہو تو ذبح کی کوئی ایسی صورت جائز نہیں ہو سکتی جس میں محل ذبح کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔

(۴) ذبح اختیاری کے مواقع میں غیر اختیاری ذبح کے کیا احکام ہیں؟ کیا ائمہ کے ہاں کچھ گنجائش ہے؟

اس امر میں ائمہ اور فقہاء متفق الرائے ہیں کہ ذبح اختیاری کے مواقع میں غیر اختیاری طریقۂ ذبح جائز نہیں ہے۔ کچھ رعایت اور رخصت کا سراغ اگر ملتا ہے تو صرف اس قدر کہ مثلاً کوئی پالتو جانور بدک جائے یا کوئی اونٹ بھڑک جائے تو اگرچہ وہ مقدور علیہ جانوروں میں سے ہے لیکن چونکہ نحر یا ذبح کرنے سے عاجزی ہے اس لیے اس کا تذکیہ کسی بھی تیز دھار دار چیز سے جسم کے کسی حصہ کو مجروح کر کے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی جانور کسی کنویں وغیرہ میں گر جائے یا وہ گردن کی جگہ سے مٹی یا بوجھ میں دبا ہوا ہو اور جب تک نکالا جائے مرنے کا اندیشہ ہو یا وہ جانور بے موقع دبا ہوا ہو، آدمی وہاں تک نہ پہنچ سکتا ہو تو دور ہی سے تکبیر پڑھ کر برچھی مارے اور خون بہہ جائے تو وہ حلال ہے ۔۔ ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے پالتو جانور کو کوئی دور سے نشانہ لے کر دھار دار چیز سے مارے اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اس کا نحر ہو جائے یا گردن کی رگیں کٹ جائیں تو یہ ذبیحہ حلال ہوگا۔ گویا ذبح اختیاری میں اصل اعتبار محل ذبح میں رگوں کے کاٹنے کا ہے اور اضطراری میں محل ذبح کے بجائے کسی بھی حصۂ جسم کو مجروح کر کے خون نکال دینے کا ہے۔

مبحث دوم (۱) ذابح کے لیے ضروری شرائط

ذابح کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ وہ مسلم یا کتابی ہو جیسا کہ ارشاد ہے:

(الف) إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (المائدہ ۳) یعنی حلال صرف وہ ہے جس کا تذکیہ تم نے کیا ہو۔

(ب) وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (المائدہ: ۵) یعنی اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔

مشرک یا مجوسی کا ذبیحہ حلال نہیں ہے کیونکہ:

(الف) وہ مسلم یا اہل کتاب نہیں ہیں، چنانچہ حضورؐ نے مجوس کے بارے میں فرمایا:

سنوا بهم سنة أهل الكتاب غير ناكحي نساءهم ولا آكلي ذبائحهم (موطا مالک)

یعنی مجوس کی عورتوں سے نکاح اور ان کا ذبیحہ کھانا درست نہیں۔

(ب) وہ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرتے ہیں: وأنعام لا يذكرون اسم الله عليه افتراء عليه (الانعام ۱۳۸)

(ج) وہ غیر اللہ کا نام لے کر یا ان کے تقرب کے لیے ذبح کرتے ہیں: وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ (المائدہ: ۳)

(د) وہ بتوں سے منسوب قربان گاہوں میں ذبح کرتے ہیں: وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدہ ۳)

ذابح کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ذبیحہ پر بوقت ذبح اللہ کا نام لے، یہ شرط تذکیہ کے ارکان میں سے ایک مستقل رکن ہے جس کے لیے سوالنامہ میں آگے الگ ایک مبحث خاص کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہیں اس پر تفصیلی بحث ہوگی۔

(۲) کتابی کا ذبیحہ

قرآن مجید کی رو سے کتابی کا ذبیحہ مسلمان کے لیے حلال ہے اور اس کی حلت کی بھی وہی شرائط ہیں جو مسلمان کے ذبیحہ کی ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(الف) سورۂ المائدہ میں ارشاد ہوا ہے :

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ	آج تمہارے لیے طیبات حلال کر دئے
وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	گئے، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے
حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ	ان کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور
(المائدہ : ۵)	تمہارا کھانا ان کے لیے حلال۔

(ب) اس سے قبل کی آیت میں فرمایا :

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ	لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے
قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ	کیا حلال ہے، کہو: تمہارے لیے طیبات
(المائدہ : ۴)	حلال ہیں۔

(ج) سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا :

وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ	وہ ان کے لیے طیبات کو حلال کرتا
عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۱۵۷)	اور ان پر خبائث کو حرام کرتا ہے۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ اہلِ کتاب کا وہی ذبیحہ حلال ہے جو طیبات کی قبیل سے ہو نہ کہ از قسم خبائث۔ نیز سورۂ مائدہ ہی میں اس سے پہلے کی دو مفصل آیتوں میں کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ خبائث کیا ہیں اور طیبات کیا؟ ان میں تذکیۂ حیوان کے تینوں ارکان کا ذکر بھی موجود ہے۔ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ (المائدہ ۳) کے ٹکڑے میں تذکیہ کا ذکر ہے یعنی یہ کہ جانور کو ذبح کیا جائے اور یہ ذبح کا کام مسلمان انجام دے۔ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ (المائدہ ۴) کے ٹکڑے میں تسمیہ کا بیان موجود ہے۔ نیز مَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ اور مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ، کی حرمت بھی المائدہ ۳ میں ہی مذکور ہے۔

ان صریح وضاحتوں کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ 'وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ' کے فقرے نے حرمت سے متعلق سورۂ نحل، انعام، بقرہ اور خود اس سورۂ مائدہ کی تمام آیات کو منسوخ کر دیا یعنی اہلِ کتاب کے دسترخوان کے مردار، خون، سور اور نذر لغیر اللہ سب کو مطلقاً حلال کر دیا۔ یا یہ کہے کہ اس ٹکڑے نے ان سب کی حرمت کا حکم منسوخ کر دیا، صرف سور کا حکم منسوخ نہیں کیا۔ یا یہ کہے کہ اس نے صرف تسمیہ کے حکم کو منسوخ کیا ہے اور باقی چیزوں کا حکم منسوخ نہیں کیا تو ان دعووں کے لیے دلیل چاہیے

ہہہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس آیت کے ذریعہ تمام احکام حلت وحرمت کے نسخ یا ان میں سے ایک کے نسخ اور دوسرے کے بقا کا خالی خولی دعویٰ کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے کسی نقلی یا عقلی دلیل کی ضرورت ہوگی۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تفریق اور یہ استثناء قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے ماخوذ یا کس عقلی دلیل پر مبنی ہے۔ صرف یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہلِ کتاب کو کچھ کھاتے ہیں پھر بھی اس نے ہمیں ان کے ہاں کھانے کی اجازت دی، ہمیں ان کے ہاں سوٗر، مردار، خون، غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ اور جھٹکا کھانے کا پروانہ نہیں دے دیتی۔ اس استدلال کی جڑ خود وہ آیتیں کاٹ دیتی ہیں جو خبائث کی حرمت، طیبات کی حلت اور تذکیہ کی تشریح میں آئی ہیں۔ زیرِ بحث فقرے کا پہلا جزء 'الیوم اُحِلَّ لکُمُ الطَّیِّبَاتُ' کا فرمان غذا و طعام کی حلت کے معاملہ میں طیبات کو اصل قرار دیتا ہے۔ 'مَا اُھِلَّ بِغَیْرِ اللّٰہِ' اور 'مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ' میں (ما أھل اور ما ذُبح) صیغۂ مجہول کے ذریعہ یہ کہنا کہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے اور جسے بتوں کی قربان گاہوں پر ذبح کیا جائے وہ حرام ہے، خود اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ اس طرح کے دونوں ذبیحے حرام ہوں گے خواہ ذابح مسلم ہو یا کتابی۔ پھر تسمیہ کے سلسلہ کی دونوں بنیادی آیتوں 'فَکُلُوا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ' اور 'وَلَا تَاْکُلُوا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ' میں بھی صیغۂ مجہول معنی خیز ہے۔ ان میں بھی یہ بات صاف کر دی گئی کہ 'مَا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ' کھایا جائے اور 'مَا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ' نہ کھایا جائے۔ 'ما ذکر' اور 'ما لم یذکر' کا صیغۂ مجہول اس سے بحث نہیں کرتا کہ ذابح کون ہے، مسلم یا کتابی؟ گویا ذبیحہ کی حلت کے لیے ذِکرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ شرط واجب ہے۔

فقہاء کے مسالک

(۱) حنفیہ اور حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے ذبیحہ کی حلت کے لیے بھی وہی قیود ہیں جو ذبیحۂ مسلم کے لیے ہیں اور تسمیہ ان میں شامل ہے۔ (المذاھب الاربعۃ ۱/۷۲۶)

(۲) شافعیہ کہتے ہیں کہ تسمیہ سرے سے واجب ہی نہیں ہے، نہ مسلم کے لیے نہ کتابی کے لیے۔ (کتاب مذکور ۲/۲۳)

(اس مسلک کی کمزوری پر آگے تسمیہ کے باب میں بحث کی گئی ہے)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) مالکیہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب کے لیے تسمیہ شرط نہیں ہے۔ (کتاب مذکور ۲/۲۳)
اس کے حق میں دلیل صرف یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت کا بھیجا ہوا گوشت بلاتحقیق کھالیا تھا۔ مگر یہ واقعہ تسمیہ کے حکم سے اہل کتاب کے استثناء کی دلیل صرف اسی صورت میں بن سکتا تھا جبکہ یہ بات ثابت ہوتی کہ اس زمانہ میں عرب کے یہودی اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرتے تھے اور پھر بھی حضورؐ نے ان کا ذبیحہ تناول فرمالیا۔ ممکن ہے کہ حضورؐ کو اپنے زمانہ کے یہودیوں کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ اللہ کا نام لے کر ہی ذبح کرتے ہیں۔ اس لیے آپؐ نے بلاتأمل ان کا لایا ہوا گوشت کھالیا ہو۔

(۴) حضرت ابن عباسؓ کا قول یہ تھا کہ آیت 'وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ' نے آیت 'وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ' کو منسوخ کردیا اور اہل کتاب اس حکم سے مستثنیٰ کردئے گئے۔ (ابوداؤد، کتاب الأضاحی) لیکن اگر ان کی طرف اس قول کی نسبت درست ہے تو یہ واضح ہے کہ یہ ابن عباسؓ کی ذاتی تاویل ہے نہ کہ کوئی حدیث مرفوع اور وہ بھی اس رائے میں منفرد ہیں، کوئی دوسرا صحابی اس تاویل وتفسیر میں ان کا ہم خیال نہیں ہے۔ پھر اس بات کی کوئی معقول وجہ بھی ان سے منقول نہیں ہے کہ اس آیت نے اُس آیت کو کیوں منسوخ کیا اور صرف اسی آیت کو منسوخ کیوں کیا، کھانے پینے کے متعلق باقی ساری قیود کو بھی اس نے کیوں منسوخ نہیں کیا۔

(۵) حضرات عطاء، اوزاعی، مکحول اور لیث بن سعد کا مسلک یہ تھا کہ اس نے نے 'مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ' اور 'مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ' کو حلال کردیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ۲/۳۹۵) مگر اتنی بڑی بات کی دلیل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہل کتاب غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کرتے ہیں اور پھر بھی اس نے فرمایا کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اہل کتاب میں سے نصاریٰ سوٗر کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔

ان مختلف مذاہب میں صحیح اور قوی مذہب صرف حنفیہ اور حنابلہ کا ہے۔ باقی مذاہب کے وجوہ ودلائل اس قدر کمزور ہیں کہ ان کی بنیاد پر کسی حرام کا حلال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کسی واجب کا غیر واجب ثابت ہونا بہت مشکل ہے (تفہیمات مولانا مودودی حصہ سوم)

(۳۴) کتابی سے مراد اور اس دور کے اہلِ کتاب

اہلِ کتاب ان اقوام کا لقب ہے جو کسی نبی مرسل کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی کتاب منزل کا اقرار کرتے ہوں (الدر المختار، کتاب النکاح) یعنی جو خدا کے وجود، رسالت اور وحی والہام کے قائل ہوں اور کسی ایسے نبی اور ان کی کتاب پر ایمان رکھتے ہوں جن کی نبوت کی تصدیق خود اسلام نے کی ہے۔ ایسی قومیں دو ہی ہیں: یہود اور نصاریٰ۔ قرآن نے ان کے معاملہ میں اکل ذبیحہ اور نکاحِ کتابیہ کی جو رخصت برتی ہے وہ اس کے باوجود کہ ان کے عقائد حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیح علیہما السلام کے بارے میں غلو آمیز ہیں اور ان کا ذکر قرآنی نصوص میں موجود ہے۔ گویا یہودیت اور نصرانیت کی ایمانی بنیادوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ان کی دیگر بدعقیدگیاں اور بداعمالیاں حلت ذبیحہ کے لیے مانع نہیں ہیں جس طرح مسلمان کے ذبیحہ میں یہ چیزیں مانع نہیں ہیں الایہ کہ کوئی ایسا عقیدہ اختیار کرے جو صریح ارتداد اور ملتِ اسلام سے خارج کرنے والا ہو۔

تاہم اس رخصت اور اجازت کے باوجود خاص ذبیحہ کے معاملہ میں یہ امر مسلّم ہے کہ ذابح خواہ مسلم ہو یا کتابی، وہ اصولاً اور عقیدتاً اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کا قائل ہو۔ وہ اہلِ کتاب جن کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہو کہ وہ حرام وحلال کے بارے میں اپنے مذہب کے قیود کے سرے سے قائل ہی نہیں اور جو اصولاً یہ مانتے ہی نہیں کہ جانور کے حلال وحرام ہونے میں اللہ یا غیر اللہ کا نام لینے اور نہ لینے کا بھی کوئی دخل ہے ان کا ذبیحہ حلال ہونے کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ اس فرق اور تخصیص کی تائید نصاریٰ بنی تغلب کے بارے میں حضرت علیؓ کے اس فتوی سے بھی ہوتی ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں کیونکہ وہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں۔ (تفسیر مظہری ۳/۳۹)

آج کے یہود ونصاریٰ کی اقلیت ہی اپنے مذہب پر عقیدتاً قائم ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت صرف قومی حیثیت سے برائے نام باعتبار مردم شماری یہودی اور عیسائی ہے۔ یہ لوگ فی الواقع نہ تورات وانجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور نہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی اور نہ حلت و حرمتِ ذبیحہ میں مذہبی احکام کا کوئی دخل تسلیم کرتے ہیں۔

شافعیہ نے زمانۂ نبوت محمدی کے نسلی اہلِ کتاب اور تکمیلِ اسلام کے بعد یہودیت و نصرانیت قبول کرنے والوں میں فرق کیا ہے۔ بعد والوں کا ذبیحہ وہ حلال قرار نہیں دیتے۔ حضرات علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا مسلک بھی یہی نقل کیا جاتا ہے۔ حنفیہ نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ یہی مسلک ابن عباس، حسن بصری، عطا بن ابی رباح، شعبی عکرمہ، قتادہ، زہری، حکم اور حماد رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ (تفسیر خازن) اور یہی رائے ابن تیمیہؒ کی ہے۔

بعض فقہاء نے نئے قادیانی (مرزائی احمدی) بننے والے کو مرتد کے حکم میں اور نسلی قادیانی کو اہلِ کتاب کے حکم میں رکھا ہے۔ بعض نے دونوں میں کوئی تفریق نہیں کی ہے بلکہ دونوں کو اہل کتاب کا درجہ دیا ہے۔ لیکن بعض فقہاء کا خیال یہ ہے کہ قادیانی خواہ نئے ہوں یا نسلی ان کی حیثیت اہلِ کتاب کی نہیں ہو سکتی۔ یہودی اور نصرانی کے علاوہ اب کوئی قوم اہلِ کتاب قرار نہیں دی جا سکتی اور حقیقتاً یہی آخری رائے صحیح ہے۔

مبحث سوم (۱) تسمیہ کی شرط کی حقیقت

ذبیحہ کے تذکیہ کے لیے تیسری لازمی شرط یہ ہے کہ جانور کو قتل کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اس حکم کو قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے:

(الف) ایجابی طور پر فرمایا گیا: فَکُلُوا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ بِاٰیٰتِہٖ مُؤْمِنِیْنَ (الانعام ۱۱۸)

مزید تاکید کی گئی: وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (الانعام ۱۱۹)

(ب) سلبی انداز میں فرمایا گیا: وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَفِسْقٌ (الانعام ۱۲۱)

(ج) سدھائے ہوئے درندوں کے ذریعہ سے شکار میں بھی ہدایت فرما دی گئی:

فَکُلُوْا مِمَّا اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ، وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سَرِیْعُ الْحِسَابِ (المائدہ: ۴)

(۵) قرآن بیشتر مقامات پر لفظ تذکیہ یا ذبح استعمال ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی جگہ 'جانور پر اللہ کا نام لینے' کے الفاظ بطور اصطلاح استعمال کرتا ہے:

(۱) لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (الحج ۲۸)

(۲) لِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا لِّیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (الحج ۳۴)

(۳) فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا صَوَافَّ (الحج ۳۶)

(۴) وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (الانعام ۱۲۱)

(۵) فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (الانعام ۱۱۸)

(۶) وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (الانعام ۱۱۹)

(۷) وَاَنْعَامٌ لَّا یَذْکُرُوْنَ اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا افْتِرَاءً عَلَیْہِ (الانعام ۱۳۸)

ذبح کے لیے تسمیہ کی اصطلاح کا یہ مسلسل اور پے در پے استعمال اس امر کی صریح دلیل ہے کہ قرآن کی نگاہ میں ذبیحہ اور تسمیہ ہم معنی ہیں کسی ذبیحۂ حلال کا تصور تسمیہ کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور تسمیہ ذبیحۂ حلال کی عین حقیقت میں شامل ہے۔

تسمیہ کی شرعی حیثیت صحیح روایات میں

احادیث صحیحہ میں یہ بات مزید تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مذکور ہے:

(۱) عن رافع بن خدیج ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما أنھر الدم وذکر اللہ علیہ فکلوہ (بخاری ومسلم)

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس جانور کا خون بہا دیا جائے اور اس پر اللہ کا نام بھی لیا جائے تو اسے کھاؤ۔

(۲) عن عدی بن حاتم قال قال النبی ؐ امر الدم بما شئت واذکر اسم اللہ (ابوداؤد ونسائی)

حضرت عدی بن حاتم ؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز سے چاہو تم خون بہاؤ اور اس پر تم اللہ کا نام لو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) وعنه: إذا ارسلت کلبك فاذکر اسم الله فان امسك علیك فادرکته حیا فاذبحه وإن ادرکته قد قتل ولم یاکل منه فکل ..... وإذا رمیت سهمك فاذکر اسم الله۔ (بخاری ومسلم)

حضرت عدیؓ ہی سے روایت ہے جب تم اپنے کتے کو (شکار پر) بھیجو تو اللہ کا نام لو، اگر وہ شکار کو پکڑ کر زندہ حالت میں تمہارے حوالے کرے تو اسے ذبح کرو اور اگر مردہ حالت میں تم اسے پاؤ بشرطیکہ اس نے اس میں سے کچھ کھایا نہ ہو تو تم اسے کھا سکتے ہو..... اور جب تم اپنے تیر سے کسی جانور کا نشانہ لو تو اس وقت بھی اللہ کا نام لو۔

(۴) وعنه: وما صدت بقوسك فذکرت اسم الله علیه فکل وما صدت بکلبك المعلّم فذکرت اسم الله علیه فکل (ابوداؤد ونسائی)

حضرت عدی ہی راوی ہیں کہ جو شکار تم تیر سے کرو اور اس تیر اندازی کے وقت تم اللہ کا نام لے لو تو اس شکار کو کھا سکتے ہو اسی طرح جو شکار سدھائے ہوئے کتے کے ذریعہ حاصل ہو اور اس موقع پر بھی تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو وہ شکار بھی کھایا جا سکتا ہے۔

(۵) وعنه: وما علمت من کلب أو باز ثم أرسلته وذکر اسم الله علیه فکل مما امسك علیك (ابوداؤد واحمد)

ان ہی سے روایت ہے .... کہ سدھائے ہوئے کتے یا باز کا پکڑا ہوا شکار کھایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسے شکار کو پکڑنے کے لیے بھیجتے وقت خدا کا نام لیا گیا ہو۔

(۶) عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے پوچھا: اگر میں خدا کا نام لے کر اپنا کتا چھوڑوں، پھر جب شکار کے پاس پہنچوں تو وہاں ایک اور کتا بھی کھڑا نظر آئے اور پتہ نہ چل سکے کہ دونوں میں سے کس نے یہ شکار مارا ہے تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلا تأکل فانما سمیت	تم اسے مت کھاؤ اس لیے کہ تم
علی کلبك و لم تسمّ علی	نے اپنے کتے کو بھیجتے وقت خدا کا نام
غیرہ	لیا تھا، دوسرے کتے کے ساتھ تم نے
(بخاری و مسلم)	خدا کا نام نہیں لیا تھا۔

اللہ اور اس کے رسول کے ان صاف اور قطعی احکام کے بعد اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ شریعت میں ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ شرط ہے اور جس جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر مارا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے۔

(۲) متروک التسمیہ عمداً، نسیاناً اور سہواً کے احکام

مذاہب فقہ میں سے حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ اس پر متفق ہیں کہ جس جانور پر قصداً اللہ کا نام لینے سے احتراز کیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے۔ البتہ اگر بھولے سے تسمیہ چھوٹ گیا ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔ حضرات علیؓ، ابن عباسؓ، سعید بن المسیب، زہری عطاء، طاؤس، مجاہد، حسن بصری، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، جعفر بن محمد اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کا بھی یہی مسلک منقول ہے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک تسمیہ عمداً چھوٹا ہو یا بھولے سے، دونوں صورتوں میں ذبیحہ حرام ہو جائے گا۔ ابن عمرؓ، نافع، شعبی، محمد بن سیرین، ابو ثور اور داؤد ظاہری کی یہی رائے ہے اور یہی رائے امام مالک کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے۔ ابراہیم نخعی تسمیہ سہواً چھوٹ جانے پر جانور کو مکروہ تحریمی سمجھتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا ایک مشروع و مسنون طریقہ تو ضرور ہے تاہم اگر نہ لیا جائے خواہ قصداً ہو یا سہواً، دونوں صورتوں میں ذبیحہ حلال ہوگا۔ صحابہ میں سے ابوہریرہؓ اور مجتہدین میں سے امام اوزاعی کے سوا یہ کسی کا مسلک نہ تھا۔ اگرچہ بعض روایات میں ابن عباسؓ، عطاء بن ابی رباح، امام احمد اور امام مالک کی طرف بھی یہ رائے منسوب کی گئی ہے لیکن ان کا ثابت شدہ مسلک اس کے خلاف ہے۔

تسمیہ کی حیثیت کے بارے میں شافعیہ کے دلائل اور ان کی کمزوری

دلیل اول: شافعیہ کی پہلی دلیل سورۃ الانعام کی آیت ۱۲۲ ہے جس کی تشریح وہ آیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵،۴ کو ملا کر یوں کرتے ہیں:
لَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (الانعام ۱۲۱) فسقا أهل لغير الله
به (الانعام ۱۴۵) "نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس حال میں کہ وہ فسق ہو کہ اللہ کے سوا دوسرے کا نام اس پر لیا گیا ہو، اسی طرح وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ متروک التسمیہ ذبیحہ اس حالت میں حرام ہے جب کہ اس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ جس کا 'مفہوم مخالف' ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ 'متروک التسمیہ ذبیحہ اس حالت میں حرام نہیں ہے جب کہ اس پر غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو'۔ گویا محض ترکِ تسمیہ سے کوئی حرمت واقع نہیں ہوتی۔

لیکن شافعیہ کی اس تاویل پر متعدد قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

اولاً، آیت کے متبادر معنی وہ نہیں ہیں جو اس تاویل کے ذریعہ لیے گئے ہیں آیت کو پڑھ کر اس معنی کی طرف ذہن خود بخود منتقل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر آدمی پہلے یہ ارادہ کر لے کہ تسمیہ کے بغیر ذبح کیے ہوئے جانور کو حلال قرار دینا ہے تب بہ تکلف اس آیت کے یہ معنی نکال سکتا ہے۔

ثانیاً، قرآن نے بہت سے ایسے کاموں کو فسق کہا ہے جن میں معصیت اور نافرمانی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اب اگر ایک عملِ فسق کی تفسیر بعینہ دوسرے عمل فسق سے محض اس بنا پر کی جائے کہ دونوں اعمالِ فسق ہیں تو یہ بات اصولِ تفسیر کے سراسر خلاف ہے کیونکہ مختلف اعمال کو فسق قرار دینے کی وجہ اور نوعیت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (الانعام ۱۲۱) جس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ ذبیحہ پر ترکِ تسمیہ فسق ہے، دوسری جگہ فرمایا: أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ (الانعام ۱۴۵) یعنی ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لینا فسق ہے۔ اب اگر اس عمل فسق کی تفسیر اس عملِ فسق سے کرنا درست ہے اور اس طرح مَا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ کو مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ بنا دینا جائز ہے تو یہ بھی درست ہونا چاہیے کہ برعکس صورت یعنی اس فسق کی تفسیر اُس فسق سے کرنا جائز ہو اور مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ صرف اس وقت حرام ہو جب کہ غیر اللہ کے ساتھ اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو لیکن اگر غیر اللہ کے ساتھ اللہ کا نام بھی لیا گیا ہو تو اسے حلال ہونا چاہیے۔ فسق مَا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام ۱۲۲)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تقدیم اور فسق ما اُھل لغیر اللہ بہ (الانعام ۱۴۵) کے ذکر کا بعد میں آنا بھی تقاضا کرتی ہے کہ دوسرے 'فسق' کو پہلے سمجھے ہوئے معلوم فسق کے ذریعہ سمجھا جائے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس تفسیر کی اجازت کسی نے نہیں دی ہے۔

ثالثاً، اگر اللہ تعالیٰ کو وہی بات کہنی ہوتی جو شوافع کہتے ہیں تو 'وھو فسق' (اس حال میں کہ وہ فسق ہو) فرماتا، نہ کہ 'وانّہ لفسق' (اس حال میں کہ یقیناً وہ ضرور فسق ہو) کیونکہ جملہ حالیہ میں اِنَّ اور لام تاکید کا استعمال نہ صرف بلاغت کے خلاف ہے بلکہ عربی زبان کے استعمالات کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس واؤ کو عاطفہ مان کر جملہ فعلیہ انشائیہ (ولا تاکلو) پر جملہ اسمیہ خبریہ (وانہ لفسق) کا عطف درست ہے کیونکہ بوقتِ ضرورت یہ بلاغت کے خلاف نہیں ہے۔ خود اسی آیت میں وانہ لفسق کے بعد والے فقرے 'وان الشیاطین لیوحون إلیٰ اولیاءھم لیجادلوکم' میں واؤ شافعیہ کے نزدیک بھی عاطفہ ہی ہے جب کہ اس کا عطف جملہ فعلیہ انشائیہ (ولا تأکلوا) پر ہی ہو رہا ہے۔ پھر قرآن میں ایسے عطف کی مثال شاذ بھی نہیں ہے مثلاً فاجلدوھم ثمانین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شھادۃ أبدا واولئك ھم الفاسقون (النور ۴)

رابعاً، جب شوافع کی تاویل کے مطابق اصل مقصود صرف اس جانور کو حرام کرنا ہے جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو تو یہ مدعا تو 'لا تاکلوا مما اھل لغیر اللہ بہ' کہنے سے زیادہ بہتر طریقہ پر حاصل ہوتا پھر 'مما لم یذکر اسم اللہ علیہ' کے ٹکڑے کی کیا حاجت رہی۔

خامساً، 'لا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ' میں 'مالم یذکر اسم اللہ علیہ' کا مدلول دو ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک متروک التسمیہ عمداً، دوسرے سہواً۔ اب اگر سہواً کی صورت اس حکم سے مستثنیٰ ہو اور عمداً کی صورت کو بھی مستثنیٰ کر دیا جائے تو آیت کا کوئی مصداق باقی نہیں رہتا اور اس طرح پوری آیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اس لیے کہ آیت بامعنی اسی وقت قرار پا سکتی ہے جب کہ اس کا کوئی مصداق موجود ہو۔

دلیل ثانی: حضرات شافعیہ کی دوسری دلیل یہ حدیث ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ کچھ لوگ (جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے) باہر سے ہماری بستی میں گوشت بیچنے آتے ہیں، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں۔ کیا ہم یہ گوشت کھا سکتے ہیں؟ حضور نے اس کے جواب میں فرمایا: "سموا علیہ انتم وکلوہ" تم خود ہی اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور کھاؤ (بخاری، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) اس سے شافعیہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ تسمیہ واجب نہیں، ورنہ حضور شک کی حالت میں اس گوشت کے کھانے کی اجازت نہ دیتے، حالانکہ ان کے مدعا کے برخلاف اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تسمیہ کا واجب ہونا عہد نبوی میں ایک معلوم و معروف مسئلہ تھا، تب ہی تو وہ سوال کرتے آئے تھے۔ پھر جواب میں حضور نے یہ نہیں فرمایا کہ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ شرط نہیں ہے بلکہ فرمایا تو یہ کہ تم خود خدا کا نام لے کر کھا لیا کرو۔ یعنی یہ کہ مسلمان کے ذبیحہ کے متعلق یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ قاعدے کے مطابق ٹھیک ذبح کیا گیا ہوگا، اگر دل میں کوئی شک رہ ہی جائے تو رفع وسواس کے لیے خود بسم اللہ کہہ لیا کرو۔

دلیل ثالث: ان کی تیسری دلیل مراسیل ابوداؤد کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذبیحۃ المسلم حلال، ذکر اسم اللہ اولم یذکر انہ ان ذکر لم یذکر الا اسم اللہ (مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، خواہ اس نے اللہ کا نام لیا ہو یا نہ لیا ہو۔ وہ نام لے گا بھی تو ظاہر ہے اللہ ہی کا لے گا۔ یہ حدیث اول تو ایک غیر معروف تابعی کی مرسل روایت ہے جو قرآن کی متعدد آیات اور مرفوع متصل احادیث کے مقابلہ میں نہیں رکھی جا سکتی۔ دوسرے شافعیہ کے مدعا کے برعکس اس کے معنی تو بس یہ ہیں کہ کوئی مسلمان اگر تسمیہ کے بغیر جانور ذبح کر بیٹھا ہو تو اسے عمداً ترکِ تسمیہ پر محمول کرنے کے بجائے نسیان پر محمول کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اگر وہ نام لیتا تو اللہ ہی کا نام لیتا، غیر اللہ کا نہ لیتا اور اس بنا پر اس کے ذبیحہ کو حلال سمجھ کر کھا لیا جائے۔ اس سے یہ مضمون بہر حال نہیں نکلتا کہ ذبیحہ پر سرے سے اللہ کا نام لینا ہی ضروری نہیں ہے۔ (تفہیمات حصہ سوم مع حذف واضافہ)

(۴) کیا متروک التسمیہ عمداً کی حرمت پر سلف کا اجماع تھا؟

اس سوال کی نوعیت و حیثیت اب محض معلومات عامہ کے سوالات کی سی ہے۔ حقیقتاً اس سوال کا مسئلہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس بحث میں کسی کا استدلال شافعیہ کے خلاف یہ نہیں ہے کہ چونکہ اس مسئلہ پر سلف کا اجماع رہا ہے اور اجماع ادلہ شرعیہ میں سے ایک دلیل قطعی ہے اس لیے شوافع کا اختلاف ناقابل جواز ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجماع کا دعویٰ کیا بھی ہے تو کم ازکم اس نوع کے اجماع کا نہیں جس سے اختلاف کرنا جائز نہ ہو، کیونکہ اگر بات یہ ہوتی تو شوافع کے خلاف سب سے پہلا فردِ جرم یہی ہوتا۔ پس جب اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے حقِ اختلاف کو سب نے تسلیم کرلیا تو اب اہم چیز اجماع کی بحث نہیں بلکہ دلائل کی قوت اور وزن ہے۔

(۴) اگر اجماع تھا تو امام شافعیؒ کے اختلاف کی کیا حیثیت ہوگی، کیا یہ اختلاف رافعِ اجماعِ سلف ہوگا؟ فی الواقع تمام ہی مکاتبِ فقہ شافعیؒ کے اختلاف کو رافعِ اجماعِ سلف ماننے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ اول تو اس مسئلہ پر سلف کا اجماعِ تام ثابت کرنا آسان نہیں، دوسرے ایک پورے مکتبِ فقہ کے اختلاف کے بعد قرارِ اجماعِ سلف کے قول کے کوئی معنی نہیں۔ مگر محض ان کی رائے کا رافعِ اجماع ہونا بجائے خود کوئی وصف نہیں ہے کہ اس بنا پر ضرورتاً (بوقت حاجت شدیدہ) ان کی رائے پر عمل کرنے کا جواز پیدا ہوجائے۔ ان کی رائے کو رافعِ اجماع تسلیم کرلینے سے فرق بس یہ پڑتا ہے کہ ان کی رائے پر غور و بحث کا جواز پیدا ہوجاتا ہے اور یہ ان کی رائے کا قابلِ غور و تحقیق ٹھیرنا بھی اس لیے ہے کہ اس مسئلہ کی بنیاد جن نصوص پر ہے وہ احتمالات کی گنجائش رکھتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ شریعت میں جو مسائل منصوص ہیں مگر ان سے متعلق نصوص واردہ دلالۃً قطعی نہیں ہیں بلکہ ذرا بھی محتمل المعانی ہیں ایسے تقریباً سب کے سب مسائل مجتہد فیہ اور نتیجتاً مختلف فیہ ہو گئے ہیں۔ جبکہ وہ مسائل جو پہلے ہی غیر منصوص ہیں اور جن کا مدار بالکلیہ قیاس و استنباط پر ہے وہ تو مجتہد فیہ اور غیر اجماعی رہے ہیں۔ یہ قاعدہ علماء کے درمیان مسلّم ہے کہ مجتہد فیہ اور مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ کی بنیاد قوتِ دلیل ہے۔ اسی لیے ائمہ کے اختلافات میں ہمارے ردّ و قبول کا معیار بس یہی ایک اصول ہونا چاہیے یعنی علمی استدلال کا طریقہ۔ دلائل کے وزن کو میزانِ شریعت پر تولا جائے اور ہر رائے کو وہی درجہ دیا جائے جو اس میزان کی رو سے اس کا قرار پائے۔

(۵) کیا ضرورتاً امام شافعیؒ کی رائے پر عمل کی گنجائش ہوسکتی ہے؟ (اس بارے میں وضاحت کی ضرورت ہے) اگر اس سوال میں 'ضرورت' کا لفظ اضطرار کے معنی میں ہے تو سوال ہی عبث ہے کیونکہ اضطرار کی صورت میں خود اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت پر کیوں نہ عمل کیا جائے، امام شافعیؒ کی رائے پر عمل کے کیا معنی ہیں؟ اگر 'ضرورت' سے مراد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاجتِ شدیدہ ہے تو یہ سوال موجودہ صورت میں ذرا تشنہ ہے۔ مکمل سوال یوں ہوگا کہ: کیا ضرورتاً امام شافعیؒ کی رائے پر عمل کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ جبکہ جمہور ائمہ کی رائے اس کے برعکس ہے عرض یہ ہے کہ مذکورہ سوال میں موافق و مخالف شخصیات اور ان کی تعداد کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر رائے مانگی گئی ہے حالانکہ شریعت کا مزاج اور اس کی روح 'موازنۂ شخصیات' کے بجائے 'موازنۂ دلیل' کی طالب ہے۔ سوال کا لہجہ ایسا ہے جیسے سائل کہہ رہا ہو کہ اصل تو جمہور کی رائے ہے مگر امام شافعی علیہ الرحمہ بھی امام مجتہد ہیں لہٰذا بوقت ضرورت ان کی رائے پر عمل کر لینے میں کیا حرج ہے؟ ہمارے نزدیک سوال اصلاً یوں ہونا چاہیے کہ کیا ضرورتاً متروک التسمیہ عمداً ذبیحہ کو کھانے کی گنجائش ہو سکتی ہے جبکہ اس کا کھانا فی الاصل ناجائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موافق و مخالف اشخاص اور ان کی تعداد کو درمیان میں لائے بغیر محض مسئلہ کی علمی تحقیق کی جائے اور اس تحقیق کی روشنی میں جس رائے کا جو درجہ طے ہو اس کے ساتھ وہی طرزِ عمل اپنایا جائے۔ علمی تحقیق کے نتیجہ میں دو رایوں کے درمیان یا تو (الف) اولیٰ و غیر اولیٰ، اوسع و غیر اوسع، احوط و غیر احوط کی نسبت ہوگی، یا (ب) محض راجح و مرجوح کی، یا (ج) محض صحیح و غیر صحیح اور خطا و صواب کی۔ آخر الذکر صورت میں صحیح کو قبول کرنے اور غیر صحیح کو رد کر دینے کے سوا کوئی طرزِ عمل درست نہیں ہو سکتا۔ درمیانی صورت میں بوقت حاجت، بقدر حاجت مرجوح پر عمل کی گنجائش ہونی چاہیے اور پہلی صورت میں مکلّف (مبتلیٰ بہ) کے حسبِ حال عمل کی اجازت ہونی چاہیے۔ اگرچہ معیاری طرزِ عمل تینوں صورتوں میں یہی ہے کہ ادنیٰ کے بجائے اعلیٰ پر انسان عمل پیرا ہو کیونکہ علم و تحقیق کی روشنی میں وہی منشاء شارع سے زیادہ قریب ہونے کا ظن غالب رکھتا ہے۔ جہاں تک اضطرار کا تعلق ہے تو وہ علیحدہ شئے ہے جس میں بقدر ضرورت شریعت کا اصل حکم ہی مرتفع ہو جاتا ہے۔ تسمیہ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ میں مذکورہ دونوں رایوں کے مابین نسبت صواب اور خطا کی ہے۔ اس لیے ضرورتاً بھی نادرست رائے پر عمل کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ دراصل شریعت نے ذبح اختیاری کے مثالی طریقۂ ذبح کی تفصیلات بتانے کے بعد انسان کی حاجت اور حرج کا خیال کرتے ہوئے ان تمام انتہائی رخصتوں کا خود ہی تذکرہ کر دیا ہے جو غیر اختیاری طریقۂ ذبح میں بھی لازماً ملحوظ رہنی چاہئیں۔ حیوانی غذا کی حلت و حرمت کے باب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں عزیمت ورخصت کی تمام صورتوں کی تعیین کے بعد اب اس میں ترمیم کی بمشکل ہی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد از روئے قرآن صرف اضطرار کی وہ صورت رہ جاتی ہے جس کی تصریح وتشریح خود قرآن نے بتکرار کی ہے۔ یعنی یہ کہ انسانی غذاؤں میں سے حرام گوشت کے سوا جان بچانے کے لیے کچھ موجود نہ ہو تو اسے کھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بس یہی وہ صورت ہے جس میں حرمت وحلت کے بنیادی احکام شارع کی طرف سے بلاجذبۂ نافرمانی، بقدر ضرورت، بکراہت قلب مرتفع ہوتے ہیں۔ قرآن نے اس کا تذکرہ ۵ مقامات پر کیا ہے: الانعام ۱۱۹، ۱۴۵، النحل ۱۱۵، البقرہ ۱۷۳، المائدہ ۳۔ سورۂ بقرہ کے الفاظ ہیں

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (البقرہ ۱۷۳)

اگر حلال گوشت ملنے کی کوئی صورت نہ ہو اور غیر حیوانی غذائیں آدمی کو مل رہی ہوں تو ممکن ہے کہ یہ حاجت شدیدہ کے زمرہ میں آجائے مگر اضطرار تو قطعی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حاجت اور زینت کی بنا پر جو رعایت ورخصت شریعت میں مل سکتی ہے وہ بس یہی کہ انسانی ذبیحہ کے ساتھ ساتھ مشینی ذبیحہ بھی جائز ومباح ہو، نہ یہ کہ ضرورت کا نام لے کر تذکیہ وحلت کے کسی بنیادی رکن کو ہی ساقط کر دیا جائے۔ پھر جب یہ کسی خطہ کی پوری ملت مسلمہ کا مسئلہ ہو تو یہ اور بھی احتیاط کی مقتضی ہے اور پوری ملت پر یہ ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے کہ وہ خدا ورسول کی ہدایات کے مطابق اپنی غذائی ضرورتوں کا انتظام کرے۔

محور سوم۔ (۶) تسمیہ عمل ذبح پر واجب ہے یا مذبوح پر؟

اس پر تفصیل سے آگے بحث آرہی ہے۔ اس سلسلہ میں شریعت کا اصولی حکم کیا ہے فقہاء نے اس کی وضاحت اپنے اپنے انداز سے کی ہے۔ چنانچہ صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی کے الفاظ میں حکم تسمیہ کا لب لباب یہ ہے:

(الف) تسمیہ سے مراد تسمیہ علی الذبیحہ ہے، تسمیہ لافتتاح العمل نہیں، ورنہ حلال نہ ہوگا۔ (۴۸/۵)

(ب) حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک ذبح اختیاری میں وقت تسمیہ وقت ذبح ہے۔ البتہ زمان قلیل سے تحرز ممکن نہیں (۴۸/۵)

(ج) حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ ذابح کا اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے وقت تسمیہ کہنا ضروری ہے (۴۸/۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(د) ذبحِ اضطراری میں وقتِ تسمیہ بوقتِ رمی وارسال ہے (۶ / ۲۸۴)

(ھ) ذبحِ اختیاری میں تسمیہ کی ذبیحہ پر تعیین ضروری ہے، ذبحِ اضطراری میں یہ شرط نہیں ہے (۶ / ۲۸۶)

(و) وان تکون التسمیۃ من نفس الذابح حال الذبح و الرامی حال الرمی فلو سمّی غیر الفاعل لا یحل الاکل و أن یکون الذبح عقب التسمیۃ قبل تبدیل المجلس (المذاھب الاربعۃ ۱/۷۲۶)

ترجمہ: تسمیہ ذبح کرنے والے کی طرف سے ہو ذبح کے وقت اور تیر انداز کی طرف سے ہو تیر اندازی کے وقت اگر ذابح ورامی کے علاوہ کسی اور شخص نے اللہ کا نام لے لیا تو اس جانور کا کھانا جائز نہ ہوگا اور یہ شرط بھی ہے کہ ذبح تسمیہ کے بعد اور مجلس کے تبدیل کرنے سے قبل ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ذبحِ اختیاری میں تسمیہ ذبیحہ پر بوقتِ ذبح ہے اور ذبحِ اضطراری میں عدم قدرتِ تعیین کی وجہ سے نیا بتاً آلہ پر بوقت ارسال ہے یعنی اختیاری میں مسمّیٰ علیہ مذبوح ہے اور اضطراری میں آلۂ ذبح۔ اسی لیے اختیاری میں ذبیحہ پر تسمیہ کی تعیین شرط ہے جبکہ اضطراری میں ذبیحہ کے بجائے آلہ پر تسمیہ کی تعیین ضروری ہے۔ چنانچہ اختیاری میں تبدلِ مذبوح جائز نہیں مثلاً کوئی کسی جانور کو ذبح کرنے والا ہو اور تسمیہ پڑھ لے، اتنے میں جانور کو کوئی بدل دے یا کسی دوسرے جانور کی گردن بھی پہلے کے ساتھ ملا کر رکھ دے تو ایسی حالت میں تبدیل کیا ہوا یا شامل کیا ہوا جانور حلال نہ ہوگا کیونکہ اس پر تسمیہ پڑھا ہی نہیں گیا بلکہ اسے تو تسمیہ پڑھنے کے بعد لایا گیا یہی معنی ہیں ذبیحہ پر تسمیہ کی تعیین کے۔ اسی طرح غیر اختیاری میں تبدلِ آلہ جائز نہیں مثلاً کوئی اپنے سدھائے ہوئے کتے سے شکار کرنے چلے اور تسمیہ پڑھ لیا ہو مگر پہلے کے بجائے دوسرے کتے کو بھیجے یا پہلے کے ساتھ بعد میں ایک اور کو بھیج دے تو شکار حلال نہیں ہوگا کیونکہ آلۂ مسمّیٰ علیہ سے شکار نہیں ہوا یا آلۂ غیر مسمّیٰ علیہ شریک ہوگیا الا یہ کہ مسمّیٰ علیہ کتے نے الگ شکار کیا ہو، تو صرف وہی حلال ہوگا۔ اضطراری میں مذبوح پر تعیینِ تسمیہ شرط نہیں ہے مثلاً کوئی ایک فاختہ کا نشانہ لے کر تیر چلائے مگر نشانہ خطا کر کے تیر اس کے بجائے کسی کبوتر کو جا لگے تو یہ حلال ہوگا اور اختیاری میں آلہ پر تعیینِ تسمیہ شرط نہیں ہے مثلاً کوئی تسمیہ پڑھ کر جانور کو ایک چھری سے ذبح کرتے والا ہو مگر پھر دوسری چھری سے ذبح کردے تو یہ جائز ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں تک تعددِ ذبائح بیک تسمیہ کا تعلق ہے تو یہ ذبح اختیاری اور غیر اختیاری دونوں صورتوں میں جائز ہے۔ مثلاً ذبحِ مقدور علیہ میں متعدد جانوروں کی گردنوں کو ترتیب سے اوپر تلے یا دائیں بائیں ملا کے رکھ کر بڑی چھری سے بیک تسمیہ و عمل ذبح کریں یا ذبحِ غیر مقدور علیہ میں متعدد جانوروں کا بیک تسمیہ و ارسال شکار کریں۔ بلکہ اس میں یہ بھی جائز ہے کہ کوئی سدھایا ہوا کتا ایک ارسال میں متعدد جانوروں کو الگ الگ شکار کرے۔ بیک تسمیہ تعددِ آلہ بھی ذبحِ اختیاری اور غیر اختیاری دونوں میں جائز ہے مثلاً بیک تسمیہ و ارسال پانچ سدھائے ہوئے کتوں سے شکار کریں یا بیک تسمیہ و عمل کوئی آدمی کسی جانور کو اپنے دونوں ہاتھوں کی دو چھریوں سے بیک وقت ذبح کرے۔

سوالنامہ میں دریافت یہ کیا گیا ہے کہ تسمیہ عمل پر ہے یا مذبوح پر؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تسمیہ نہ علیٰحدہ عملِ ذبح پر واجب ہے اور نہ علیٰحدہ مذبوح پر۔ اس سلسلہ میں صحیح تعبیر یہ ہے کہ ذبحِ اختیاری میں تسمیہ "مذبوح پر بوقت ذبح" اور غیر اختیاری میں "آلہ پر بوقتِ ارسال" واجب ہے۔ تسمیہ کے ساتھ وقتِ ذبح اور وقتِ ارسال کی قید عمل متعدد بیک تسمیہ یا ارسالِ متعدد بیک تسمیہ کے منافی ہے یعنی ایک تسمیہ میں متعدد عملِ ذبح یا متعدد ارسالِ آلہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تسمیہ کے "بوقت عمل و ارسال" ہونے کا مطلب "بیک عمل و ارسال" ہونا ہے یعنی توحدِ عمل و ارسال۔ اب اگر ایک تسمیہ میں متعدد عمل و ارسال ہو تو یہ تبدلِ عمل و ارسال کے ہم معنی ہے کیونکہ ٹھیک ایک تسمیہ کے وقت متعدد عمل یا ارسال کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے لامحالہ یہ تبدلِ عمل ہی ہے اور اسی لیے ناجائز ہے۔ اس کے برخلاف مذبوح و آلہ میں تعدد اور تبدل دو الگ الگ چیزیں ہیں چنانچہ ان میں تعدد بیک تسمیہ تو جائز ہے کیونکہ تسمیہ کے لیے توحدِ مذبوح و آلہ شرط نہیں ہے مگر تبدل ناجائز ہے اس لیے کہ تعینِ مذبوح و آلہ شرط ہے۔ گویا ہر عمل کے وقت نیا تسمیہ واجب ہوگا اور اس میں وہ متعدد جانور ذبح ہو سکتے ہیں جو بوقتِ عملِ ذبح تسمیہ پڑھنے کے وقت موجود تھے مگر تسمیہ کے بعد نیا جانور لانے پر نیا تسمیہ ضروری ہوگا کیونکہ وہ جانور مسمّٰی علیہ نہیں ہوا۔

(۷) کیا ذابح (ذبح کرنے والا) کا تسمیہ کافی ہے یا اس کے مددگار کے لیے بھی تسمیہ کہنا ضروری ہے اور یہ کہ مددگار کون کہلائے گا: جانور کے بدن اور اس کے پیروں کو پکڑنے والا، یا چھری چلانے میں مدد کرنے والا؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سوال کے مثبتی پہلو پر آئندہ بحث ہوگی۔ فقہاء نے اس کے اصولی پہلو پر جو گفتگو کی ہے اس کا اختصار درج ذیل ہے:

(الف) تسمیہ فی الاصل ذابح پر واجب ہے۔ کوئی دوسرا تسمیہ پڑھ دے اور ذابح خاموش رہے یا انسان کے علاوہ کوئی دوسری چیز بسم اللہ پڑھے تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔ (بدائع ۵/۴۸)

(ب) صاحب رد المحتار علامہ شامی شریک فی الذبح کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ جو شخص ذابح کے ہاتھ کو زور دے اور چھری چلانے میں اپنے ہاتھ کا سہارا دے وہ شریک فی الذبح ہے اور اس پر تسمیہ ضروری ہے۔ (۵/۲۹۲)

(ج) فتاوی ہندیہ اور قاضی خاں میں اس کی مزید مثالیں درج ہیں:

جیسے ذابح چھری پر قصاب کے ہاتھ کے ساتھ اپنا ہاتھ رکھے تاکہ دونوں ذبح میں باہم معاونت کریں یا یہ کہ کمان کھینچنے سے عاجزی کی بنا پر کوئی اس کی اعانت اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کرے یا یہ کہ ذابح کے ہاتھ میں چھری ہو اور کوئی چھری والے ہاتھ کو پکڑ کر ذبح کرے۔

مذکورہ توضیحات سے معلوم ہوا کہ چھری چلانے میں مدد کرنے والا 'شریک ذابح' ہے اور اس طرح کی تمام صورتوں میں 'شریک فی الذبح' پر تسمیہ واجب ہے اور جس پر یہ تفسیر صادق نہ آتی ہو اس پر تسمیہ واجب نہیں ہے۔ چنانچہ جانور کے بدن اور اس کے پیروں کو پکڑنے والا اس تشریح کی رو سے 'معینِ ذابح' (ذابح کا مددگار) ہے اور اس پر تسمیہ واجب نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے 'معین ذابح' پر بھی تسمیہ واجب کہا ہے۔ اس کے لیے وہ مسند احمد کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر اس حدیث سے وجوب تسمیہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ محض وقوع تسمیہ کا ثبوت ملتا ہے اور صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'معین مطلق' بھی چاہے تو بطور استحباب تسمیہ پڑھ سکتا ہے کیونکہ وقوع مستلزم وجوب نہیں ہوتا۔ ابو اسد اسلمی اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں۔

کنت سابع سبعة مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ثم بعد کلام طویل) فأمر رسول اللہ فأخذ رجل برجل ورجل برجل ورجل بید ورجل بید ورجل بقرن ورجل بقرن و ذبحہا السابعة وکبرنا جمیعا (احمد) یعنی حضورؐ کے ساتھ ہم سات آدمی تھے ...... آپؐ نے ہمیں ذبح کرنے کا حکم دیا تو ہم میں سے دو آدمیوں نے جانور کا ایک ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیر، دو آدمی نے ایک ایک ہاتھ اور دو آدمی نے ایک ایک سینگ کو پکڑ لیا اور ساتویں آدمی نے اسے ذبح کیا اور ہم سب نے تکبیر کہی۔

مذکورہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ "شریکِ ذابح" پر تسمیہ واجب ہے کیونکہ وہ ذابح کا صرف معاون ہی نہیں ہوتا بلکہ ذبح میں یک گونہ شریک ہوتا ہے۔ البتہ معین مطلق پر تسمیہ واجب نہیں کیونکہ وہ عملِ ذبح میں ذابح کا صرف معاون ہوتا ہے، ذبح کرنے میں اس کا شریک نہیں ہوتا۔

"شرکت فی الذبح کی صورتیں"

عملِ ذبح میں ذابح کے ساتھ شرکت کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) دو آدمی ایک جانور کو ایک چھری سے مل کر ذبح کریں۔ اس صورت کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شرکت میں (توحد آلہ، توحد وقت اور عملِ ذبح میں شرکتِ مُشاع) پائی جارہی ہے۔

(۲) دو آدمی ایک جانور کو ایک چھری سے اس طرح ذبح کریں کہ ذابح ایک رگ کاٹے، اس کے بعد دوسرا اسی چھری سے باقی رگیں کاٹے۔ اس شکل میں (توحد آلہ، تعددِ وقت اور عملِ ذبح میں شرکتِ تعیین) پائی جارہی ہے۔

(۳) دو آدمی ایک جانور کو دو چھریوں سے اس طرح ذبح کریں کہ پہلا ایک رگ کاٹے، اس کے بعد دوسرا اپنی چھری سے بقیہ رگیں کاٹے۔ اس قسم میں (تعددِ آلہ، تعددِ وقت اور عملِ ذبح میں شرکتِ تعیین) پائی جارہی ہے۔

ایک چوتھی شکل یہ ہے کہ دو آدمی ایک جانور کو الگ الگ دو چھریوں سے بیک وقت ذبح کریں۔ اس نوع میں (تعددِ آلہ، توحد وقت اور تعددِ عمل) پایا جارہا ہے۔ چونکہ عملِ ذبح میں دونوں نہ تو باہم معاون ہیں اور نہ شریک، اس لیے دونوں حقیقتاً دو مستقل ذابح ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شریک فی الذبح وہ معاون ہے جو ذابح کے ساتھ عملِ ذبح میں شریک ہو، خواہ یہ شرکتِ مشاع ہو یا شرکتِ تعیین نیز اس میں آلۂ ذبح اور وقتِ ذبح کا توحد یا تعدد دونوں کی گنجائش ہے یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ معین ذابح وہ ہے جس کا عین عملِ ذبح میں کوئی حصہ نہ ہو۔

© rasailojaraid.com